© rasailojaraid.com

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تقسیم کے بعد

(۱۱)

از سعید احمد اکبر آبادی

۱۹۴۷ء میں تقسیم کے ساتھ ملک آزاد ہوا تو اب یونیورسٹی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ تقسیم کو جس اصول اور جن وعدوں اور یقین دہانیوں کے ساتھ منظور کیا گیا تھا اور اس سلسلہ میں ۳رجون ۱۹۴۷ء کو پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر محمد علی جناح نے اپنے ہاں کی اقلیتوں کے بارہ میں جو کچھ فرمایا تھا اگر اس پر عمل کیا جاتا تو بات ہی کچھ نہ تھی، جس طرح ملک کی دوسری یونیورسٹیاں تھیں ایک یہ یونیورسٹی بھی تھی۔ ان کی ہیئتِ ترکیبی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس یونیورسٹی پر بھی نہ ہوتا، لیکن تقسیم سے پہلے جو شدید فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوگئی تھی اور جس کے نتیجہ میں سرحد کے اُدھر اور اِدھر جو سیلابِ اشک وخون متلاطم ہوا اس نے یونیورسٹی کے نفسِ وجود کو معرضِ خطر میں ڈال دیا۔ تقسیم کے وقت یونیورسٹی کے وائس چانسلر نواب محمد اسماعیل خاں صاحب مرحوم تھے جو مسلم لیگ کے بھی ایک نہایت اہم اور باوقار سربراہ تھے۔ اگر حالات نارمل ہوتے تو کوئی ضرورت نہ تھی کہ موصوف کو تقسیم کے بعد ان کا ٹرم ختم ہونے سے پہلے وائس چانسلر کے عہدہ سے سبکدوش کیا جاتا، لیکن حالات ایسے تھے کہ موصوف نے خود اس عہدہ پر قائم رہنا پسند نہیں کیا اور وہ الگ ہوگئے۔ ان کے بعد پنڈت جواہر لال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی متفقہ رائے سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم اس عہدہ کے لئے منتخب ہوئے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت اِس سے بہتر کوئی دوسرا انتخاب نہیں ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

ڈاکٹر صاحب ہندوستان کی ایک نہایت باوقار، معزز اور محترم شخصیت تھے، ان کو حکومت اور اکثریت اور مسلمانوں سب کا اعتماد حاصل تھا، ان کی لیاقت و قابلیت، ان کا تعلیمی تجربہ، ان کی اخلاقی سربلندی اور عظمت، ان کی جرأت حق گوئی و حق کوشی، ایک اعلیٰ مقصد کے لئے غیر معمولی ایثار و قربانی، ان کی سادہ اور بے لوث زندگی، یہ سب چیزیں روزِ روشن کی طرح ہر شخص پر عیاں تھیں، اس بنا پر جب وہ وائس چانسلر منتخب ہوئے تو ملک میں ہر طرف اس پر مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا گیا، اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت ڈاکٹر صاحب کے سپرد جو ذمہ داری کی گئی تھی وہ وقت کی ایک نہایت اہم، نازک مگر سخت دشوار اور مشکل ذمہ داری تھی، اس ذمہ داری سے باحسن وجوہ وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا تھا جو دل میں سوز رکھتا ہو اور روشن دماغی کے ساتھ جس کی نظر بھی پاک ہو۔ اور ڈاکٹر صاحب میں ان اوصاف کی کمی نہیں تھی، مرحوم کے برادر خورد ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے بقول (یادوں کی دنیا ص ۱۴۱) مرحوم کو شروع میں علی گڑھ جانے میں پس و پیش تھا، لیکن پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اصرار پر وہاں جانے پر رضامند ہو گئے اور انھوں نے یہ اہم اور نازک ذمہ داری سنبھال لی۔

ڈاکٹر صاحب یہاں کم و بیش آٹھ برس رہے، ان کے اس عہد کا یقیناً یہ بڑا کارنامہ ہے کہ یونیورسٹی کے نفسِ وجود کو ہی جو خطرہ لاحق ہو گیا تھا، یونیورسٹی اس خطرہ سے نہ صرف یہ کہ محفوظ رہی، بلکہ جہاں تک تعلیمی اور انتظامی شعبوں کا تعلق ہے ان میں غیر معمولی وسعت پیدا ہوئی اور وہ ملک کی دوسری اعلیٰ ترقی یافتہ یونیورسٹیوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگی، ڈاکٹر صاحب کو یقیناً اس بات کا بھی کریڈٹ ملنا چاہیئے کہ اس مدت میں انھوں نے کبھی اس امر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو فراموش نہیں کیا کہ وہ کسی عام یونیورسٹی کے نہیں، بلکہ "مسلم یونیورسٹی" کے وائس چانسلر ہیں، چنانچہ نواب زادہ لیاقت علی خاں جو علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے ان کی وفات پر طلبار نے اپنی یونین کی دیرینہ ضابطہ کے ماتحت جب یونیورسٹی کا سائرن بجادیا اور اس پر ہندو فرقہ وارانہ اخبارات نے یونیورسٹی پر گندگی اچھالی تو ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر یونیورسٹی کے دفاع میں ایک ایسا پرزور بیان شائع کیا کہ ان اخبارات کے دانت کھٹے ہو گئے۔ لوگوں کا عام تاثر یہ ہے کہ یہ بیان ایسا ہی دندان شکن تھا جیسا کہ مولانا آزاد کی پارلیمنٹ میں وہ اہم تاریخی تقریر تھی جو انھوں نے ٹنڈن جی کی ایک تقریر کے جواب میں کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے جب وائس چانسلر کی حیثیت سے علی گڑھ میں قدم رکھا (اکتوبر ۱۹۴۸ء) تو اس وقت عالم یہ تھا کہ یونیورسٹی کے نامور اور دیرینہ اساتذہ کی ایک خاصی تعداد پاکستان جا چکی تھی، بچے کھچے جو یہاں تھے ان میں بھی متعدد اساتذہ جانے کے لئے پرتول رہے تھے، علاوہ ازیں ملک کے اور دوسرے علاقوں کا حال بھی یہی تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان ہندوستان میں خال خال رہ گئے تھے، بیرونی ممالک میں جو مسلمان اعلیٰ تعلیم پا رہے تھے ان سے توقع نہ تھی کہ وہ تعلیم کی تکمیل کے بعد اپنے وطن کا رخ کریں گے، اس لئے اس وقت سب سے بڑا اہم سوال یہ تھا کہ یونیورسٹی میں پروفیسروں اور ریڈروں کی جو جگہیں عنقریب خالی ہونے والی ہیں، ان کا بندوبست کیا ہوگا؟ تعلیم اور علاجِ امراض ان دونوں میں فرقہ واریت کے کوئی معنی نہیں ہیں، اس بنا پر اس سوال کا ایک صاف اور سیدھا سا جواب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جب اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان ہیں ہی نہیں تو یونیورسٹی میں پروفیسر یا ریڈر اور لکچرر کی جو جگہ بھی خالی ہو اس پر بے تکلف کسی مستحق غیر مسلم کا تقرر ہو جانا چاہیئے، لیکن ڈاکٹر صاحب اس حقیقت سے واقف تھے کہ کسی شخص یا قوم کے جذبات اور اس کے نفسانی احساسات ہمیشہ منطق اور فلسفہ کے تابع نہیں ہوتے، اس بنا پر مسلم یونیورسٹی اگر اعلیٰ درجہ کے مسلمان اساتذہ سے خالی ہو گئی تو اس کا یونیورسٹی کی ہیئتِ انتظامیہ اور خود مسلمانوں کے دل و دماغ پر کیا اثر پڑے گا،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان وجوہ کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب نے یونیورسٹی کے اسٹڈی لیو (Study Leave) یعنی رخصت برائے تکمیل تعلیم کے قواعد وضوابط میں بہت کچھ ردوبدل کیا اور مختلف فیکلٹیز میں جو لائق وقابل اور ہونہار نوجوان اساتذہ تھے ان کو آمادہ کیا کہ وہ یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کی تکمیل کریں اور وہاں اپنے مضمون میں اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگری لیکر علی گڑھ واپس آئیں، ڈاکٹر صاحب کی تحریص وترغیب پر نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اس پر آمادہ ہوگئی اور موصوف نے ان لوگوں کے لئے ملک کے اندر اور باہر ہر قسم کی سہولتوں اور مالی امداد کا بندوبست کیا، حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کے سخت صبر آزما اور حوصلہ شکن حالات کے پیش نظر مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا یہ اس درجہ اہم اور عظیم الشان کارنامہ ہے کہ اس کی جتنی تعریف کی جائے، کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت ڈاکٹر صاحب نے یہ کارنامہ انجام دیکر اس حیثیت سے یونیورسٹی کے مسلم کردار کو تباہ ہونے سے بچالیا۔

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

چنانچہ آج آپ دیکھ لیجئے! عربی، فارسی، اردو اور دینیات کا تو کہنا ہی کیا ہے یہ شعبے تو مسلمانوں کے لئے ہی مخصوص سمجھے جاتے ہیں، آرٹس، سوشل سائنسیز، سائنس، کامرس، قانون، انجینرنگ ان سب فیکلٹیوں میں اور پالی ٹکنک اور زنانہ کالج میں آپ کو مسلمان پروفیسروں کی جو اکثریت نظر آتی اور سب ہی فیکلٹیوں کے ڈین جو مسلمان دکھائی دیتے ہیں تو یہ سب کچھ ڈاکٹر صاحب کی ہی بیدار مغزی اور روشن ضمیری کی دین ہے اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے جو داغ بیل ڈالی تھی خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ ان کے جانشینوں نے اس کو آگے بڑھایا، ترقی دی اور پروان چڑھایا، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج علم وفن کا کوئی شعبہ یونیورسٹی میں ایسا نہیں ہے جس میں یورپ اور امریکہ وغیرہ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے والے مسلمان اساتذہ کثرت سے موجود نہ ہوں، اور جو اگر لکچرر ہیں تو ریڈر کی اور ریڈر ہیں تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پروفیسر کی جگہ پر مقرر ہونے کا استحقاق نہ رکھتے ہوں۔

یونیورسٹی کے "مسلم کردار" کے سلسلہ میں اس اہم کارنامہ کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے تین اہم ریسرچ اسکیمیں جو لاکھوں روپیہ سالانہ خرچ کی تھیں حکومت سے منظور کرائیں، ان میں ایک مشرق وسطیٰ پر ریسرچ کی، ایک اسلامیات پر ریسرچ کی، اور ایک اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کی اسکیم تھی، حکومت نے اس سلسلہ میں جس فیاضی کا مظاہرہ کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کوئی اسلامی ملک بھی اس سے زیادہ اور کیا کرے گا، یہ دوسری بات ہے کہ آخری دو اسکیموں پر جو کام ہوا ہے وہ مجموعی اعتبار سے یونیورسٹی کی نیک نامی نہیں بلکہ اس کی رسوائی اور بدنامی کا باعث ہوا ہے، لیکن یہ قصور ان لوگوں کا ہے جن کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی تھی، اس میں گورنمنٹ یا ڈاکٹر صاحب کا کیا قصور ؟ ڈاکٹر صاحب جب علی گڑھ پہونچے ہیں تو اس وقت یونیورسٹی کا بجٹ پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ تھا۔ لیکن آٹھ سال کے بعد جب وہ یہاں سے رخصت ہوئے تو بجٹ پچاس لاکھ سالانہ تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس مختصر مدت میں ہی یونیورسٹی کے کاموں میں کس قدر وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اگرچہ نہایت سادہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے[1] لیکن جمالیات کا ذوق فطری تھا اور پھول پھلواری کا انھیں بڑا شوق تھا، اس کا مظاہرہ علی گڑھ میں بھی ہوا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے پوری

---

[1] جب جامعہ قرول باغ میں تھی، ہمارا دفتر برہان بھی وہیں تھا، اس لئے ہم لوگ اکثر ڈاکٹر صاحب کے مکان پر اور ڈاکٹر صاحب بھی کبھی دفتر برہان میں اور کبھی ہمارے مکان پر آتے جاتے رہتے تھے، اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کا رہن سہن کس قدر سادہ تھا! اس زمانہ میں اس کا باور کرنا بھی شاید مشکل ہو۔ ایک تخت جس پر کھدر کی چادر بچھی ہوتی تھی، دو چار مونڈھے، بس شیخ الجامعہ کے ڈرائنگ روم کی کل کائنات تھی، چائے آتی تھی تو ہندوستان کی بنی ہوئی پیالیوں میں اور وہ بھی اس طرح کہ کبھی اس کے ساتھ بسکٹ یا دال سیو آگئے تو آگئے ورنہ صرف چائے۔ اس زمانہ میں پیدل پھرنا۔ یکہ، تانگہ اور ٹراموے میں سفر کرنا ڈاکٹر صاحب کیلئے روزمرہ کی بات تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یونیورسٹی کی چمن بندی کر کے اس کو لالہ زار بنا دیا۔ غرض کہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تقسیم کے فوراً بعد ہی کے سخت نازک دور میں مسلم یونیورسٹی نہ صرف محفوظ رہی، بلکہ اس نے صورت اور معنی دونوں کے اعتبار سے جو غیر معمولی ترقی کی وہ جہاں ایک طرف گورنمنٹ کی کشادہ دلی اور نیاضی کی دلیل ہے تو دوسری جانب ڈاکٹر صاحب مرحوم کی بیدار مغزی، روشن دماغی اور ان کے عزم و خلوص کا بھی روشن ثبوت ہے۔

۱۹۵۱ء کا ایکٹ

ڈاکٹر صاحب کے زمانہ میں ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کے بجائے ایک نیا ایکٹ بنا جو ۱۹۵۱ء مسلم یونیورسٹی امنڈمنٹ کہلاتا ہے۔ اس ایکٹ کی رو سے ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کی متعدد دفعات بدل گئیں، مثلاً ۲۰ء ایکٹ کی رو سے یونیورسٹی کورٹ کی ممبر شپ مسلمانوں کے لئے مخصوص تھی اب اس کا دروازہ غیر مسلموں کے لئے بھی کھول دیا گیا۔ پہلے وائس چانسلر کا انتخاب کورٹ کے ممبر کرتے تھے اب یہ قرار پایا کہ اگزکٹو کونسل تین اشخاص پر مشتمل ایک پینل بنائے گی اور صدر جو اپنے عہدہ کے اعتبار سے یونیورسٹی کے وزیٹر ہوں گے وہ ان تین میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے اس کو وائس چانسلر بنائیں گے، ۲۰ء کے ایکٹ میں دینیات کی تعلیم ہر مسلمان طالب علم کے لئے ضروری تھی۔ اب دینیات کو لازمی مضامین میں سے ایک مضمون بنایا گیا، یعنی اگر کوئی مسلمان طالب علم چاہے تو وہ دینیات کے علاوہ اس کا ایک متبادل مضمون بھی اختیار کر سکتا ہے، علاوہ اور چھوٹی بڑی تبدیلیاں بھی ہوئیں لیکن اہم اور بنیادی تبدیلیاں یہی تھیں۔ ہماری رائے میں یہ تبدیلیاں وقت اور حالات کے تقاضہ کے مطابق تھیں اور ناگزیر تھیں، اگر سر سید زندہ ہوتے تو یقین ہے وہ خود بھی ان کو قبول کر لیتے، کیونکہ انگریزوں کے عہد میں تو ہندو اور مسلمان الگ الگ دو کیمپ میں تھے۔ ہندو بنارس یونیورسٹی صرف ہندوؤں کے لئے تھی اور مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے، اس لئے وہاں کوئی مسلمان کورٹ کا ممبر نہیں ہو سکتا تھا اور یہاں کورٹ کی ممبر شپ مسلمانوں کے لئے مخصوص تھی، لیکن اب ملک آزاد تھا، یہاں ایک قومی حکومت قائم تھی، اور مسلم اور غیر مسلم کے درمیان تعلیم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سکے میدان میں بھی تعدد افتراق کی جو دیوار حائل تھی اسے لامحالہ گرنا تھا، یونیورسٹی اب سنٹرل گورنمنٹ کی یونیورسٹی تھی اور اس کے تمام اخراجات کی متکفل گورنمنٹ تھی اس بنا پر یہ کیونکر ممکن ہوسکتا تھا کہ کورٹ میں گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کا کوئی نمائندہ نہ ہو، یا یونیورسٹی کے غیر مسلم اساتذہ میں سے جس کو اپنے عہدہ کے اعتبار سے کورٹ کا ممبر ہونا چاہئے تھا اسے محض غیر مسلم ہونے کے باعث کورٹ کی ممبری سے محروم رکھا جاتا، یہی صورت حال اکزیکٹو کونسل اور اکاڈمک کونسل کی بھی تھی، البتہ اس میں شبہ نہیں کہ چونکہ یہ ایک اسلامی تہذیب کی نمائندہ یونیورسٹی تھی اس بنا پر اس کے اسلامی کردار کو باقی رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ کورٹ میں بہر حال اکثریت مسلمانوں کی رہے، کیونکہ یہ زمانہ جمہوریت کا ہے اور اس لئے یہاں فیصلے ووٹوں کی اکثریت پر ہوتے ہیں، مسلمانوں کے ووٹ اگر کم ہوئے تو اندیشہ ہے کہ کورٹ کبھی اپنے غیر مسلم ممبروں کے ووٹوں سے کوئی ایسا فیصلہ کر بیٹھے جس سے یونیورسٹی کا اسلامی کردار مجروح ہوجائے۔

اگرچہ بدقسمتی سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ اسلامی ملکوں میں بھی مسلمانوں میں "ترقی پسند" افکار و خیالات کے عام اور مقبول ہوجانے کے باعث اب کسی ادارہ میں مسلمانوں کی اکثریت کو بھی اسلامی مفادات کے تحفظ اور ان کی بقا کا ضامن نہیں کہا جاسکتا[1]، اور پھر یہ بھی ایک

---

[1] چنانچہ ۵۸ء میں جب میں کلکتہ سے علی گڑھ آیا تو بعض دوستوں نے بتایا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے عہد میں جب دینیات کا معاملہ اکاڈمک کونسل میں آیا تو ترقی پسند مسلمانوں کے ایک گروپ نے اس مضمون کو سرے سے ختم ہی کر دینے کی تجویز کی اور اس پر تقریریں کیں، لیکن جن لوگوں نے اس تجویز کی مخالفت میں سخت تقریریں کیں اور دینیات کو حسب سابق لازمی مضمون کی حیثیت سے باقی رکھنے کی پرزور حمایت کی ان میں پیش پیش دو ہندو پروفیسر بھی تھے، ایک فزکس ڈپارٹمنٹ کے صدر پروفیسر گل اور دوسرے شعبۂ ہندی کے صدر پروفیسر شرما۔ اور اس طرح دینیات کا مضمون اپنی حیثیت میں محفوظ رہ گیا، علاوہ ازیں خود میرے زمانہ کی بات ہے۔ ایک مرتبہ جب کورٹ میں یہ مسئلہ پیش ہوا کہ یونیورسٹی میں (بقیہ صفحہ ۱۲۳ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حقیقت ہے کہ اسلامی مفاد ہے کیا؟ اس سوال کے جواب میں بھی کوئی بات قطعیت کے ساتھ کہنا مشکل ہے، مثلاً ایک پختہ اور راسخ العقیدہ مسلمان کی ایمانداری سے یہ رائے ہے کہ لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی علم وفن کے ہر میدان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی چاہیئے کیونکہ یہ زمانہ مسابقت اور مقابلہ کا ہے اور اس لئے اسلامی مفاد کا تقاضا ہے کہ جن چیزوں سے قومیں ترقی کر رہی اور آگے بڑھ رہی ہیں ان میں مسلمانوں کا قدم بحیثیت ایک قوم کے کسی سے پیچھے نہ ہو، لیکن چند دوسرے مسلمان ہیں جو اس خیال کے حامی نہیں ہیں، اور دلائل کا سرمایہ ان کے پاس بھی کم نہیں، اب فرمایئے! اس صورت میں آپ کس خیال کو اسلام کے مفاد میں کہیں گے! بہرحال عام رسم وراہ اور قانون ودستور کے لحاظ سے کسی ایک قوم کے مفاد کو محفوظ رکھنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کے افراد اکثریت میں رہیں، وہ افراد اگر خود ہی اپنے گھر کو آگ لگانے پر تل جائیں تو دنیا میں اس کا علاج کہیں بھی نہیں۔ اس بنا پر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آزادی کے بعد (اگر ملک تقسیم نہ ہوتا تب بھی) ۱۹۲۰ء کے ایکٹ میں امنڈمنٹ ضروری تھا اور یہ امنڈمنٹ ۱۹۵۱ء ایکٹ سے زیادہ بہتر کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا، اور ہونا بھی نہیں چاہیئے، کیونکہ اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم تھے اور یہ ایکٹ انھیں کے دماغ کا تراویدہ تھا، اور کوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) موسیقی کی تعلیم کا بھی ایک شعبہ کھولا جائے تو میں نے اور بعض ممبروں نے اس کی مخالفت میں تقریریں کیں، لیکن ایک مسلمان پروفیسر نے جو نماز روزہ کے پابند تھے اس تجویز کی حمایت میں ایک طویل اور پر زور تقریر کی اور استدلال میں کہا کہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں حجاز، بغداد اور کوفہ وبصرہ موسیقی کا گہوارہ ہوگئے تھے، میں ان کی تقریر پر حیران رہ گیا۔ موصوف اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ کورٹ کی میٹنگ کے بعد جب میں نے ان سے شکایت کی کہ آپ نے یہ کیا کیا تو ایک بڑے زور کا قہقہہ لگا کر بولے۔ مجھے یقین تھا کہ تجویز منظور نہ ہوگی، لیکن میں چاہتا تھا کہ دیکھوں آپ میری دلیل کا کیا جواب دیتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمان اس کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ملک میں اسلامی مفاد کے تحفظ کا جو درد اس کے دل میں ہے وہ مولانا کے دل میں بھی نہیں تھا۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں یہ بل آیا اور منظور ہوا۔ اور اس وقت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی (جمعیت العلماء) اور مسٹر محمد اسماعیل (مسلم لیگ) پارلیمنٹ میں موجود تھے، کسی نے اس بل کی مخالفت نہیں کی۔ اخبارات میں اور پبلک میں بھی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھی۔ اور کسی نے اس پر احتجاج نہیں کیا۔[1]

اس ایکٹ کے ماتحت کورٹ میں مسلمانوں کی اکثریت کو محفوظ رکھنے کا بندوبست یہ کیا گیا تھا کہ مسلم اداروں اور مسلم علاقوں (Constituency) کو نمائندگی خاطر خواہ طور پر دی گئی تھی، چنانچہ اس ایکٹ کے ماتحت کورٹ کی جو تشکیل ہوئی اس میں جب تک یہ ایکٹ نافذ رہا مسلمانوں کی نمایاں اکثریت قائم رہی، اب رہا وائس چانسلر کا انتخاب! تو اگرچہ پہلے (۲۰ء کے ایکٹ کے ماتحت) اس کا انتخاب کورٹ کرتا تھی، اور اب یہ انتخاب بہ صورت پینل (Panel) اکزکٹو کونسل کے سپرد کر دیا گیا جس میں بھی اکثریت مسلمانوں کی ہی ہوتی تھی تو اس میں فرق ہی کیا پڑا؟ فرق صرف اس قدر ہوا کہ اب پینل میں سے انتخاب وزیٹر کے سپرد کر دیا گیا، اس سے اسلامی کردار کس طرح مجروح ہوسکتا ہے؟ وزیٹر آخر یونیورسٹی کا سب سے بڑا عہدہ دار ہے اور ملک کا صدر جمہوریہ! اگر اس پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا تو آخر یہ مسلمان اس ملک میں رہیں گے کس طرح؟ بہرحال جہاں تک کورٹ کی ممبر شپ، اس کے اختیارات اور اس کے نفوذ و اثر اور وائس چانسلر کے انتخاب کا معاملہ ہے، ۵۱ء کے ایکٹ میں ہرگز کوئی بات

---

[1] اس بے دماغی اور سبک ذہنی کی مثال بھی شاید کہیں اور مشکل سے مل سکے گی کہ جو حضرات اس وقت خاموش رہے تھے اب ۷۲ء امنڈمنٹ ایکٹ سامنے آیا تو اس کے ساتھ ساتھ وہ ۵۱ء میں بھی کیڑے نکالنے لگے ہیں گویا اب تک وہ سو رہے تھے اب جاگ پڑے ہیں یا اس وقت اُن کی زبان بندی تھی اب زبان کھل گئی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسی نہیں ہے جو یونیورسٹی کے اسلامی کردار کے نقطۂ نظر سے قابل اعتراض یا اشتباہ انگیز ہو، بلکہ حق یہ ہے کہ جدید حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دستوری طور پر دوسری سنٹرل یونیورسٹیوں کے ساتھ ہم آہنگ بنانے کے لئے یہ تبدیلیاں ناگزیر اور ضروری تھیں!

دینیات اب رہا دینیات کا معاملہ! تو اس میں بے شک یہ تغیر ضرور ہوا کہ پہلے یہ مضمون ہر مسلمان طالب علم کے لئے لازمی تھا، لیکن اب یکے از مضامین لازمی ہو گیا، اور ایک مسلمان طالب علم کو بھی یہ حق ہو گیا کہ اگر وہ چاہے تو اس کو چھوڑ کر اس کا کوئی دوسرا متبادل مضمون لے سکتا ہے، لیکن اس تبدیلی کو بھی یونیورسٹی کے اسلامی کردار پہ اثر انداز کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ سب جانتے ہیں کہ دینیات کا مضمون اب تک لازمی ضرور تھا، لیکن عملاً اس کی حیثیت کیا تھی؟ اس کا نصاب کس درجہ ناقص اور اصلاح طلب تھا، اور اس کی تعلیم کس درجہ بے اعتنائی اور بے توقیری کے ساتھ ہوتی تھی، لوگ اپنی پرائیویٹ مجلسوں میں اس کے نصاب اور طریقِ تعلیم کا مذاق اڑاتے تھے، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایک عملی اور حقیقت پسند آدمی تھے، انھوں نے محسوس کیا کہ محض کاغذی طور پر اس کو لازمی رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، جو طلباء اسے پڑھنا چاہتے ہیں انھیں ضرور اس کی تعلیم حاصل کرنی چاہئے، لیکن تعلیم صحیح معنی میں تعلیم ہونی چاہئے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا نصاب از سر نو مرتب کیا جائے، چنانچہ اس مقصد کے لئے ڈاکٹر صاحب نے ایک کمیٹی مقرر کر دی جس کے ممبر (جیسا کہ اب مجھے یاد ہے) حسب ذیل افراد تھے:

(۱) نواب حاجی عبید الرحمٰن خاں صاحب شیروانی (۲) مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی (۳) مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی (۴) مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی (۵) ڈاکٹر عبد العلیم (۶) سعید احمد اکبر آبادی۔

جب میں اس کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لئے کلکتہ سے علی گڑھ آیا تو دیرینہ تعلقات کی وجہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے ساتھ شام کے وقت ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ حسب معمول بڑے تپاک اور گرم جوشی سے ملے، اثنائے گفتگو میں دینیات کا ذکر آیا تو اپنے مخصوص والہانہ انداز میں فرمایا: لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ دینیات کا مضمون لازمی نہیں رہا۔ میں کہتا ہوں کہ کاغذی تحفظات اور محض رسم پرستی کا وقت نہیں ہے، بلکہ عمل کا اور کچھ کر دکھانے کا وقت ہے، جو طلبا کسی وجہ سے دینیات پڑھنا نہیں چاہتے ان کو خواہ مخواہ اس پر مجبور کرنا عقلمندی نہیں ہے، البتہ جو طلبا پڑھنا چاہتے ہیں ـــ اور مجھکو امید قوی ہے کہ اکثریت عظمیٰ ایسے ہی لڑکوں کی ہوگی ـــ ان کو دینیات ضرور پڑھنی چاہیئے، لیکن اس کی تعلیم محض رسمی اور برائے خانہ پری نہیں، بلکہ حقیقی اور اس کی اصل اسپرٹ کے ساتھ ہونی چاہیئے، اس سلسلہ میں سب سے مقدم بات یہ ہے کہ اس کا نصاب از سر نو مرتب کیا جائے جو وسیع و ہمہ گیر اور یونیورسٹی کے شایان شان ہو۔ یہ کمیٹی اسی مقصد کے لئے بنائی گئی ہے اور آپ کو یہ کام کرنا ہے۔

جب میٹنگ ہوئی تو نصاب سے متعلق بحث و گفتگو ہوئی اور آخر کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ میں انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے کی کلاسوں کے لئے ایک نصاب بنا کر کلکتہ سے بھیجدوں، میں نے اس تجویز کی تعمیل کی اور ایک نصاب بنا کر حاجی عبید الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کو جو غالباً اس کمیٹی کے کنوینر تھے بھیجدیا، اس کے بعد کمیٹی کی پھر ایک میٹنگ ہوئی جس میں بعد مسافت کے باعث شریک نہ ہو سکا۔ کمیٹی نے اس نصاب پر غور کر کے اس کو منظور کر لیا، اور پھر غالباً مولانا ابوالحسن علی میاں کی تحریک سے کمیٹی نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ اب میں ہی اس نصاب کے مطابق ایک کتاب تیار کروں، میں اس زمانہ میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے بعض انتظامی معاملات کی وجہ سے سخت پریشان اور پراگندہ خاطر تھا اور ابھی اپنی کتاب "صدیق اکبرؓ" کی تصنیف سے فارغ ہوا ہی تھا۔ بہر حال میں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی اور جس طرح بن پڑا دو تین مہینہ میں "دینیات" کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے حاجی صاحب موصوف کی خدمت میں اس کا مسودہ ارسال کر دیا۔ کمیٹی نے اس کو بھی پسند کیا اور منظور فرما لیا، اور خصوصاً مولانا علی میاں نے اس کی بڑی تحسین کی،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چنانچہ یہ کتاب شائع ہو کر دینیات کے نصاب میں شامل ہو گئی اور الحمدللہ کہ آج تک گریجویٹ کلاسز میں وہ شاملِ نصاب ہے، اس کے متعدد اڈیشن چھپ چکے ہیں اور یہ علی گڑھ یونیورسٹی کے نصابِ دینیات کی مقبول اور پسندیدہ کتاب سمجھی جاتی ہے۔

اس داستان سرائی کا مقصد یہ ہے کہ بدقسمتی سے بعض مسلمانوں کا وطیرہ یہ ہو گیا ہے کہ ایک بات پکڑلی اور اس پر شور مچانا شروع کر دیا۔ ان حضرات کو ۱۹۵۱ء ایکٹ پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ پہلے دینیات لازمی تھی، اب اس کی حیثیت باقی نہیں رکھی گئی۔ حالانکہ گذشتہ سطور سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ دینیات نہ صرف یہ کہ باقی رکھی گئی ہے، بلکہ اس کی فعالیت اور افادیت پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے، رہا اس کا لازمی نہ ہونا! تو عملاً اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا، کیونکہ عملاً مسلمان طلبار اب بھی ننانوے فی صدی دینیات ہی لیتے ہیں، بہرحال اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ۱۹۵۱ء ایکٹ سے یونیورسٹی کے اصل بنیادی مقاصد اور اس کی ہیئت ترکیبی پر کوئی ناگوار اثر نہیں ہوتا۔ اور یہ ایکٹ یونیورسٹی کو وقت اور زمانہ کے حالات و مقتضیات کے ساتھ مطابق کرنے کی کوئی نامستحسن کوشش نہیں ہے، جو لوگ ۱۹۷۲ء کے ایکٹ کی آڑ میں اب اس کا بھی ماتم کر رہے ہیں ان کا طریقِ فکر اور کریزت پژوہی خود لائق ماتم ہے۔

ایک مختلف فیہ شخصیت

مسلمانوں کے بعض حلقوں میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت مختلف فیہ بھی ہے، اور بعض دماغوں میں اس سلسلہ میں بڑے شکوک و شبہات ہیں۔ پھر چونکہ مسلم یونیورسٹی اپنے اس سخت بحرانی اور انقلابی دور میں ڈاکٹر صاحب کی سربراہی اور ان کی قیادت میں ہی داخل ہوئی اور اس نے اس لرزتی ہوئی زمین میں اپنے پیر جمائے ہیں اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں اس پر ذرا تفصیل سے گفتگو کریں، جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ہم لوگ جب قرول باغ میں رہتے تھے اور جامعہ بھی وہیں تھی اس زمانہ میں سب اربابِ جامعہ اور خصوصاً ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہم لوگوں کا بڑا اختلاط اور ربط وضبط تھا، ہم ان کے مکان پر اور وہ ہمارے یہاں اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ اس طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم نے انھیں خلوت میں بھی دیکھا ہے اور جلوت میں بھی، ان کی پبلک لائف بھی ہمارے سامنے ہے اور ان کی خانگی زندگی بھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے ذہن اور دماغ، علم وفضل، فکر ونظر، کردار وعمل اور اخلاق وفضائل کے اعتبار سے ایک نہایت بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے، ان کی آنکھوں میں بڑی مقناطیسی کیفیت تھی اور باتوں میں بڑا رس تھا۔ ان کا اندازِ گفتگو بڑا مخلصانہ اور دل کو موہ لینے والا تھا، جس کسی سے بات کرتے تھے وہ بے اختیار ان کی طرف کشش محسوس کرتا تھا۔ ان کے تبسم میں شہد وانگبیں کی حلاوت تھی، جس نے اسے دیکھا اس سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہا۔ اس بنا پر کوئی شبہ نہیں کہ ان کی شخصیت ایک مثالی شخصیت تھی، اگرچہ ان کے حلقہ میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کو مذہبی نہیں کہا جا سکتا لیکن ڈاکٹر صاحب خود ایک راسخ العقیدہ اور پختہ مذہبی فکر کے انسان تھے، نماز روزہ کے پابند تھے، اسلامی شعائر وروایات کے احترام کا جذبہ رکھتے تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی سے بڑی عقیدت اور ارادت رکھتے تھے۔ اسی کا اثر تھا کہ جب تیس برس کی جلاوطنی کے بعد مولانا عبیداللہ سندھیؒ ہندوستان واپس آئے تو ڈاکٹر صاحب نے بڑے شوق اور جذبہ سے ان کو اپنے ہاں جامعہ میں مہمان رکھا اور ان کے تمام اخراجات برداشت کئے، اوکھلے کے قیام کے زمانہ میں متعدد مرتبہ نظام الدین کے تبلیغی مرکز بھی گئے اور ان کے اجتماعات میں شریک ہوئے ہیں، ان کو اسلام سے وہی محبت تھی جو ایک سچے اور پکے مسلمان کو ہوتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کے ساتھ انھیں محبت نہیں عشق تھا۔ اور آخر میں تو حالت یہ ہو گئی تھی کہ

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آوے

کہتے ہیں: "ڈاکٹر صاحب صدر جمہوریہ ہونے کے بعد بدل گئے تھے" میں کہتا ہوں: جی ہاں! بدل گئے تھے لیکن ان کا دل نہیں بدلا تھا، چنانچہ جس سال ان کا انتقال ہوا ہے غالباً اسی سال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہندوستان کی طرف سے جو جج ڈیلی گیشن گیا تھا اس کے ایک ممبر ہمارے فاضل اور نہایت عزیز دوست مولانا سید منت اللہ صاحب، حالی امیر شریعت بہار بھی تھے، مولانا کا بیان ہے کہ اس موقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے رسمی طور پر ہم لوگوں کو چائے پر مدعو فرمایا، فراغت کے بعد جب ہم رخصت ہونے لگے تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے عرض کیا: "حضرت! میرے لائق خدمت کوئی کام!" ڈاکٹر صاحب نے یہ سنتے ہی میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے اور بولے: "بس! مولانا! حضور پر نور کی سرکار میں میرا سلام عرض کیجئے اور دعا فرمائیے کہ میری عاقبت بخیر ہو۔" مولانا کا بیان ہے کہ جس وقت ڈاکٹر صاحب کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے میں نے دیکھا کہ اس وقت ان کے دونوں ہاتھ کپکپا رہے تھے، آنکھیں اشک آلود تھیں اور آواز بھرائی ہوئی تھی، سینہ میں جذبات کا طوفان امڈ تا ہے تو مدعائے دل زبان و بیان کی گرفت میں نہیں آتا۔ ڈاکٹر صاحب یہ کہکر چپ ہو گئے لیکن اس کے بعد بھی دیر تک مولانا کے ہاتھ پکڑے اور ان کی طرف دیکھتے کھڑے رہے۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے خادم خاص کا جو ہر وقت ان کی خدمت میں رہتا تھا بیان ہے کہ مرحوم بہت صبح سویرے بیدار ہو جاتے اور نماز سے فارغ ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے، چنانچہ جس روز ان کا انتقال ہوا ہے اس روز بھی ان کا یہ معمول ناغہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں: "ذہنی طور پر وہ (ذاکر میاں) عقل پسند اور جذباتی طور پر مذہبی انسان ہیں، جس کسی نے انھیں راتوں کو کلام پاک کی تلاوت کرتے سنا یا دیکھا ہے وہ ان کے خشوع و خضوع سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ اپنی دینداری کو چھپاتے ہیں، اپنے قریب ترین عزیزوں سے بھی، نہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ انھیں کوئی عبادت کرتے ہوئے دیکھے،..... ان کی عبادت نمائش کے لئے نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اظہار عبودیت کے لئے ہے۔" (یادوں کی دنیا ص ۱۲۹) ان شواہد کی روشنی میں اس میں شک وشبہ

ئه چونکہ عبادت کا معاملہ اللہ اور اس کے بندہ کے درمیان راز و نیاز اور سرگوشی (بقیہ ص ۱۲۰ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہوسکتا کہ ڈاکٹر صاحب عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے پکے سچے اور مخلص مسلمان تھے۔

فلسفۂ انقلاب کہتے ہیں کہ آخر میں وہ بدل گئے تھے اور ان کی زندگی جو تقسیم کے بعد تھی اس زندگی سے مختلف تھی جو تقسیم سے پہلے تھی، آئیے اب اس پہلو پر بھی غور کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی ملک میں انقلاب پیدا ہوتا ہے تو ہمیشہ وہاں دو جماعتیں ہوتی ہیں (۱) انقلاب آفریں اور (۲) انقلاب زدہ، پہلی جماعت وہ ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں فتحمندی و کامرانی کا علم ہوتا ہے، اقتدار کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں ہوتی ہیں اور وہ طاقت و قوت کی اورنگ نشین ہوتی ہے، اس کے برخلاف دوسری جماعت انقلاب کی ماری ہوئی ہوتی ہے، انقلاب کے سیلابِ بلا کی تلاطم آفریں موجیں اس جماعت کے شیرازۂ امن وسکون کو درہم برہم اور اس کے کاشانۂ اطمینان وعافیت کو تہ وبالا کرکے رکھ دیتی ہیں۔ انقلاب کی عظیم و شدید تباہ کاریاں اس قوم کو اس درجہ خستہ حال، زبون و پامال کر دیتی ہیں کہ اس پر خوف و دہشت اور مایوسی و ناکامی کا غلبہ ہوجاتا اور میدان زندگی تنگ نظر آنے لگتا ہے، اس وقت انقلاب زدہ قوم میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں کہ "دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے" کے مطابق اپنے آپ کو وقت کے سیلاب کی موجوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ جدھر وہ موجیں لے جائیں اور جہاں چاہیں انھیں غرق کر دیں انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اکثریت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹ پر) دمناجات کا ہے اس لئے ہم نے اپنے بزرگوں کو بھی دیکھا ہے کہ مسجد میں فرض جماعت کے ساتھ ادا کیے اور اپنے خلوت کدہ میں چلے گئے وہاں دہ سنن اور نوافل اور اوراد و وظائف جو کچھ پڑھنے ہوتے تھے اور اس خاموشی اور پوشیدگی کے ساتھ کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوتی تھی اس وقت ان حضرات کا خشوع وخضوع اور ان کی محویت واستغراق کا یہ منظر دیکھنے کے لائق ہوتا تھا۔ یہ منظر ایک مرتبہ ہم نے مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر محمد اقبال کا بھی دیکھا ہے اور جو کچھ دیکھا ہے طبیعت پر اب تک اس کا اثر ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسے افراد کی ہوتی ہے جنہیں اپنے گھر کے پرانے درو دیوار سے عشق ہوتا ہے، محلہ کے گلی کوچے جن میں ان لوگوں نے بچپن کے دن اور جوانی کی راتیں گذاری ہیں ان کی ایک ایک اینٹ انھیں پیاری ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے آپ کو موجوں کے حوالہ کر دینے سے انکار کر دیتے ہیں لیکن ان میں موجوں کی بلا انگیزی کا مقابلہ کرنے کی بھی ہمت اور طاقت نہیں ہوتی، اس بنا پر وہ عالمِ حسرت و نامرادی میں اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ جاتے ہیں اور اکثر اوقات مکان کی کھڑکیاں اور دیواروں میں روشندان بھی بند کر لیتے ہیں کہ کہیں سیل رواں کی موجیں اچھل کر اُدھر سے اندر نہ آجائیں، غرض کہ پوری انقلاب زدہ قوم کے لئے اس کی زندگی کا یہ موڑ انتہائی نازک اور خطرناک ہوتا ہے، اور تشتت و انتشار، اور پراگندگی و سراسیمگی کا شکار ہو جاتی ہے، اس پر "نہ جائے رفتن و نہ پائے ماندن" کا عالم حیرانی طاری ہوتا ہے، اس کو اپنے ماضی کی شاندار عمارتیں کھنڈروں کی شکل میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہیں، حال مایوس کن اور مستقبل تاریک دکھائی دیتا ہے، کیونکہ جو لوگ اس عالم میں کہ

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

رخشِ امواج کی پشت پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے ہیں، یقین ہے کہ اب وہ اپنے وطن کو واپس نہ لوٹ سکیں گے، موجیں یا تو انھیں غرق کر دیں گی اور یا اگر وہ زندہ اور سلامت رہے بھی تو کسی دوسرے ملک کے ساحل پر انھیں پٹخ دیں گی اور وہ اس ملک کی زبان اور تہذیب اختیار کر کے اپنے لوگوں کے لئے اجنبی اور پردیسی بن جائیں گے، اب رہے وہ لوگ ــــ اور کثرت انھیں لوگوں کی ہے ــــ جو سیلاب کی ہولناکیوں سے ڈر کر اپنے گھروں اور حویلیوں کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ گئے ہیں! تو یہ بھی اپنی خیر کب تک منائیں گے، دیواریں بوسیدہ اور پرانی ہیں اور سیلاب کی قہرمانی شدید اور مسلسل موجیں ہیں کہ درو دیوار سے برابر ٹکرا رہی اور شورِ قیامت برپا کر رہی ہیں، آخر ایک وقت آئے گا جب یہ دیواریں بھی بیٹھ جائیں گی اور دروازے مقاومت کی تاب نہ لا کر دھڑام سے گر پڑیں گے، اور موجیں گھروں کے اندر گھس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آئیں گی، اس وقفہ میں اگر بڈھے بوڑھے اپنی جان سلامت لے بھی گئے تو موجیں ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد کو بہالے جائیں گی، اس طرح پوری قوم انقلاب کی زد پر اور اس کا نشانہ ہوتی ہے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے اور جو بلا ان پر مسلط ہو گئی ہے اس سے کیونکر اور کس طرح رستگاری حاصل کی جائے۔

اگر قدرت کو اس قوم کو زندہ رکھنا منظور ہوتا ہے تو اس عالم اضطراب وکشمکش میں آخر کچھ لوگ پردہ ظہور پر آتے ہیں، یہ روشن خیال اور بالغ نظر ہوتے ہیں، ان کو ایک جانب اپنے ماضی کی تابناکی اور قومی وملی انفرادیت کا یقین ہوتا ہے اور دوسری جانب وقت کی ہواؤں کا رخ پہچان لینے کا ان میں سلیقہ ہوتا ہے، وہ زمانہ کے ہاتھ کی لکیروں کو پڑھ سکتے اور انقلاب روزگار کی صداؤں کو سن سکتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اب نہ مقاومت مجہول سے کچھ فائدہ ہوگا اور نہ عزلت گزینی وفراریت کی راہ اختیار کرنے سے کام بنے گا۔ اب وقت جد وجہد اور سعی وعمل کا ہے جو وقت کے دھارے کا رخ اس طرح موڑ دے کہ وہ ہلاکت کے بجائے ان کی سلامتی کا سبب بن جائے، اور یہ کام مصالحت اور مطابقت کے ذریعہ ہی سرانجام ہو سکتا ہے، یہ لوگ شک وتردد اور حیص بیص کا لبادہ اتار کر عزم وہمت اور پامردی واستقلال کے ساتھ اپنی کشتی لیکر سیلاب میں کود پڑتے ہیں اور کہتے ہیں:

ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

یہی وہ لوگ ہیں جو اس وقت قوم کی قیادت کا فرض انجام دیتے ہیں، اور اگر وہ اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ان کی کوششوں کے صدقہ میں قوم کو حیات نو اور نشاۃ ثانیہ حاصل ہوتی ہے، لیکن ان کی راہ آسان نہیں ہوتی۔ ایک طرف وہ انقلاب آفریں قوم ہوتی ہے جو اقتدار کی مالک ہوتی ہے اور اس کے دل میں انقلاب زدہ قوم کی طرف سے شکوک وشبہات کا جس میں کچھ جذبۂ انتقام بھی شامل ہوتا ہے ایک طوفان برپا ہوتا ہے، اور دوسری جانب خود اپنی قوم ہوتی ہے جس میں احساسِ شکست، کم نظری اور کم حوصلگی، پست ہمتی اور کوتاہ بینی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے جرائم پیدا کر دیتا ہے ، اس بنا پر اس قائد کو ایک نہیں بلکہ دو دو محاذوں پر کام کرنا ہوتا ہے ، وہ غیروں کو اپنانے اور اپنے زخموں کو دھو دینے کی جو کوشش کرتا ہے اس میں بسا اوقات خود اپنوں سے جن کے لئے وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے طعن وتشنیع اور سب وشتم سننے پڑتے ہیں ، وہ اس کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے اور بات بات پر اس پر نکتہ چینی اور حرف گیری کرتے ہیں ، اور اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وقت کے سیلاب کی موجیں شدید اور باد مخالف تیز وتند ہوتی ہیں اس بنا پر کشتی شروع شروع میں اسی سمت چلتی ہے جس سمت موجیں جا رہی اور ہوائیں ان کو لئے جا رہی ہیں۔ لیکن کشتی کا ملاح اس وقت کا انتظار کرتا ہے جب کہ سیلاب کی رفتار دھیمی ہو ، موجوں کا تلاطم کم ہو اور ہوائیں مخالف نہ رہیں ۔ جب ایسا وقت آتا ہے تو کشتی کا ملاح اپنے پتوار اور بادبان درست کر لیتا ہے اور پھر کشتی کو اپنی منزل کی طرف لے آتا ہے ، یہ پورا عمل وہ ہے جو عمل مطابقت (Adjustment) کہلاتا ہے اور اگر یہ کامیاب رہے تو اس سے قوم کو دوبارہ توانائی اور مصافِ زلیست میں پیش قدمی کرنے کی ہمت ملتی ہے ۔

قوموں کے عروج وزوال کا یہی آئینِ فطرت اور ازلی دستور ہے ، اور تاریخ میں ہمیشہ اسی پر عمل ہوتا آیا ہے ، دور جانے کی ضرورت نہیں ، سرسید کو دیکھئے ! انھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد جو کام کیا اور جس نہج پر کیا اس کی نوعیت یہی تھی ، یہ ضروری نہیں ہے کہ نئے حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی جد وجہد میں ایک قائد جو کام بھی کرے اور اس سلسلہ میں اس کے زبان وقلم سے جو کچھ بھی نکلے وہ سب من وعن درست اور صحیح ہی ہو ، نہیں ! بلکہ اس میں غلطی بھی ہو سکتی ہے اور آپ اس کو اپنی زبان میں "مرعوبیت" یا فکر ونظر کی بے اعتدالی بھی کہہ سکتے ہیں ، لیکن اس شخص کی نیت اور جذبہ پر حملہ کرنا ایک شخص کے چند جزوی اقوال و اعمال کے باعث اس کی زندگی کے تمام واقعات اور اس کے کیریر سے منکر ہو جانے کے مترادف ہوگا ۔ ایک جنرل جو کسی مصلحت سے اپنی فوج کو پیچھے ہٹنے یا میدان جنگ چھوڑ دینے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا حکم دے رہا ہے آپ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے اس کو ملک اور قوم سے غداری کا الزام نہیں دے سکتے۔ چنانچہ سرسید کی نسبت کون نہیں جانتا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ بڑی حد تک ان کی ہی کوششوں اور جد وجہد کی مرہونِ احسان ہے، لیکن ساتھ ہی ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سرسید کا دامن غلطیوں سے پاک نہیں ہے، اور بعض غلطیاں ـ کوئی شبہ نہیں بہت شدید اور ناقابل تلافی ہیں، لیکن اس کے باوجود سرسید کا جو مرتبہ ومقام انیسویں صدی کے اکابر واعاظم اسلام میں ہے اس سے کون انکار کرسکتا ہے!

سرسید اور ذاکر حسین کا موازنہ اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس کو پیش نظر رکھکر سرسید اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا موازنہ کیجئے تو دونوں میں بہت سی باتوں میں مشابہت ملے گی، ذاکر صاحب کی نسبت ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے لکھا ہے کہ "وہ ذہنی طور پر عقل پسند اور جذباتی طور پر مذہبی انسان تھے" غور کیجئے، یہ فقرہ کس طرح ہو بہو سرسید پر بھی صادق آتا ہے۔ جہاں تک مذہب کے احکام و مسائل اور اس کے مباحث کا تعلق ہے سرسید کی عقل پسندی نے معتزلہ اور علم کلام کے بعض دوسرے مذاہب کے دامن میں پناہ لی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی عقل پسندی کو تصوف کے مختلف مکاتب فکر اور صوفیائے کرام کے مسلک صلح کل سے سہارا ملا۔ راگ دونوں کے الگ الگ ہیں لے بہرحال ایک ہی ہے، سرسید کو ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں سے عہدہ برآ ہونا تھا جو مسلمانوں کے خلاف شدید جذبۂ انتقام سے پر تھے اور ڈاکٹر صاحب کو ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوؤں سے معاملہ صاف کرنا تھا جو تقسیم اور اس کے ہولناک نتائج کے باعث مسلمانوں کے خلاف بری طرح بپھرے ہوئے تھے، سرسید اگر اپنی دھن اور لگن میں قرآن مجید میں تفسیر بالرائے بلکہ سچ یہ ہے کہ تحریف کی منزل تک پہونچ گئے، انگریزی لباس پہننے اور انگریزوں کی طرح پر کھانے پینے لگے تو آپ کو اس پر تعجب کیوں ہو کہ کل کا شیخ الجامعہ شنکر اچاریہ کے چرنوں میں جاکر بیٹھ گیا، دونوں ہاتھ جوڑکر نمسکار اور ہندی میں تقریر کرنے لگا۔

سرسید کا نظریہ تھا کہ انگریز اہل کتاب ہیں اس لئے ان کے ساتھ یگانگت اور مجالست پیدا کرنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چاہیئے، ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ ہندو ہمارے ہم قوم و ہم وطن ہیں، ان کی اور ہماری تہذیب جو ہندوستانی تہذیب کہلاتی ہے مشترک ہے اس لئے ہم کو اسے اپنانا چاہیئے، سرسید انگریزوں کی استرضا میں اتنے آگے نکل گئے کہ جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد اسلامی میں شریک ہونے سے انکار کردیا۔ ذاکر صاحب کو اپنے عہدۂ صدر جمہوریہ کی وضعداری میں اتنا غلو ہوا کہ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے، مسلمانوں کی حق تلفی ہوتی رہی لیکن انھوں نے اپنی زبان بند رکھی، درحقیقت یہ سب وقت کے وہ تھپیڑے ہیں جو کم یا بیش ہر اس شخص کو کھانے پڑتے ہیں جو سمندر کی متلاطم موجوں اور بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکوں میں بھی اپنی کشتی کے بادبان کو الٹ جانے سے بچانے کی فکر کرتا ہے۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گریں گے جو گھٹنوں کے بل چلے

جو غلطی ہے وہ ہزار تاویلوں اور برہان تراشیوں کے بعد بھی غلطی رہے گی، لیکن جو قوم کی خاطر "شب تاریک و بیم موج گردابے چنیں ہائل" سے دوچار ہوں اگر کہیں ان کا پاؤں پھسل جائے تو "سبکساران ساحلہا" کو زیب نہیں دیتا کہ ان کا مذاق اڑائیں، ان پر پھبتی کسیں یا خدائی فوجدار بن کر اپنی مغفرت سے زیادہ ان حضرات کی مغفرت کی فکر کرنے لگیں، ہونا تو نہیں چاہیئے تھا لیکن بدقسمتی سے ہوتا یہی آیا ہے، سرسید نے کالج قائم کیا اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کردیا لیکن جب کالج کے اسٹاف سے متعلق پالیسی کا معاملہ آیا اور پرانے ساتھیوں سے ان کو اختلاف ہوا تو مولوی طفیل احمد منگوری جیسے لوگوں نے کہنا شروع کردیا کہ "سرسید آخر میں وہ نہیں رہے تھے جو شروع میں تھے، بلکہ بدل گئے تھے" یہی معاملہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ساتھ پیش آیا، وہ یونیورسٹی کے سربراہ ہوئے اور اس کی تاریخ کے نہایت نازک دور میں اس کی حفاظت کی اور اس کی بنیادوں کو مضبوط بنا کر اسے ترقی دی، لیکن جب ان کی بعض چیزوں سے کچھ لوگوں کو اختلاف ہوا تو انھوں نے کہنا شروع کردیا کہ ذاکر صاحب بدل گئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے، حالانکہ جہاں تک دل اور ضمیر اور ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کا تعلق ہے ذاکر صاحب کا حال اس شعر کے مصداق تھا:

نہ میں بدلا نہ تم بدلے نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیونکر اعتبارِ انقلابِ آسماں کرلوں

بہرحال ڈاکٹر صاحب کے عہد وائس چانسلری میں یونیورسٹی کا نہ اسلامی کردار بدلا اور نہ وہ جسے آج کل اقلیتی کردار کہتے ہیں تبدیل ہوا۔ طلبار اور اساتذہ میں، کورٹ میں اور اکزیکٹو کونسل میں ہر جگہ مسلمانوں کی اکثریت تھی، دینیات کی تعلیم کا وہی اہتمام تھا، مساجد اور ان میں اماموں اور موذنوں کا وہی انتظام، عربی، فارسی، اردو اور اسلامیات اور ریسرچ کا بندوبست پہلے سے زیادہ، رمضان شریف کے احترام اور عید میلاد النبی کے جلسے کی وہی شان، تجوید وقرأت کی تعلیم کا وہی ساز وسامان، غریب مسلمان طلبار کے لئے وظائف اور مالی امداد کے وہی طریقے۔ یہ سب چیزیں علیٰ حالہا اور بجنسہا قائم رہیں۔ بلکہ وقت اور ضرورت کے تقاضہ کے مطابق ہی ان میں ترقی ہوئی۔

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے عہد میمنت مہد میں یونیورسٹی کی ہیئت ترکیبی واجتماعی میں چند در چند ایسی تبدیلیاں ضرور ہوئیں جنھیں دیکھکر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب یونیورسٹی کا چلن وہ نہیں رہا ہے جو پہلے تھا اور اب وہ ایک دوسرے ہی ڈگر پر چل پڑی ہے، لیکن یہ تبدیلیاں جن وجوہ اور اسباب سے پیدا ہوئیں غالباً ڈاکٹر صاحب کا ان پر اختیار نہ تھا اور وہ خود بھی ان پر خوش اور مطمئن نہ تھے، چنانچہ سب کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب ان سے بددل اور بیزار ہوکر اپنے عہدے کے دوسرے ٹرم کے پورا ہونے سے کئی سال پہلے ہی اس عہدہ سے سبکدوش ہوکر اپنے گھر جامعہ نگر میں جا بیٹھے، ڈاکٹر صاحب کی بددلی اور بیزاری کے کیا اسباب تھے؟ اس پر اس واقعہ سے روشنی پڑے گی، بہار کے گورنر ہونے کے زمانہ میں جب جنوری ۱۹۵۹ء میں ڈاکٹر صاحب جدیوپور یونیورسٹی میں خطبۂ جلسۂ تقسیم اسناد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پڑھنے کے لئے کلکتہ تشریف لائے اور کئی روز کلکتہ میں مغربی بنگال کی گورنر مس پدمجا نیڈو کے مہمان کی حیثیت سے گورنمنٹ ہاؤس میں قیام فرمایا تو دیرینہ تعلقات کی وجہ سے ازراہ کرم وعنایت مجکو بھی یاد فرمایا۔ چنانچہ ایک دن میری درخواست پر مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں بھی تشریف لائے، تمام اساتذہ اور طلبار سے ملاقات کی اور مدرسہ کے کاموں اور اس کی عمارتوں کا معائنہ کیا، اور اس کے علاوہ جب تک وہ کلکتہ میں رہے میں روزانہ شام کے وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ اس وقت حسب عادت وہ بہت بے تکلف ہوکر گفتگو کرتے تھے جس میں سنجیدہ علمی موضوعات کے ساتھ کچھ ہنسی مذاق کی باتیں بھی ہوتی تھیں، ایک دن اسی طرح کی گفتگو کے موقع پر میں نے عرض کیا: ڈاکٹر صاحب ابھی تو آپ کی وائس چانسلری کی مدت کے ختم ہونے میں دو برس باقی تھے، آپ اس سے پہلے ہی سبکدوش ہوگئے، کیوں؟ اپنے خاص انداز میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے فرمایا: میں کیا کرتا! وہ لوگ جن کو میں اپنا دست وبازو بنا کر علی گڑھ لایا اور ان کو ترقیاں دیں، جب وہ ہی قدم قدم پر میرے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگے تو میں علی گڑھ نہ چھوڑتا تو کیا کرتا۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ جملہ ان کے سوز دروں اور کرب نہاں کا غماض ہے، میں اگرچہ علی گڑھ سے بہت دور تھا، لیکن وہاں کے حالات اور سیاست سے بے خبر نہ تھا، ڈاکٹر صاحب یہ جملہ فرما کر خاموش ہوگئے اور میں نے بھی اس کی مزید تشریح کرانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ علی گڑھ سے ان کی یہ ناراضگی آخر وقت تک رہی اور ان کا دل کبھی ادھر سے صاف نہیں ہوا۔

© rasailojaraid.com